حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ

ازقلم: قاسم مالیگانوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آئندہ کل میں ایسے شخص کے ہاتھ میں پرچم دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے، اور اللہ ورسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔

یہ جملہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ رسالت سے غزوۂ خیبر کے موقع پر ایسی شخصیت کے متعلق جاری ہوا جسے ابوالحسن، شیرِ خدا، خلیفۂ چہارم، دامادِ رسول، ابن عم النبی حضرت علی ابن ابی طالبؓ کے نام سے جانا جاتا ہے، جن کی پوری تربیت خود نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نگرانی میں فرمائی تھی، جس کے بعد حضرت علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن سے تادمِ آخر علاحدہ نہ ہوئے۔

نام ولقب اور والدین

آپ کا نام علی، کنیت ابوالحسن وابوتراب، اور لقب حیدر کرار ہے۔

والد کا نام ابوطالب ہے، جو بدقسمتی سے دل کی اندھیری دنیا کو شمع ایمان کے نور سے منور نہ کرسکے، اور ”إنک لا تهدي من أحببت“ کا ایک جیتا جاگتا نمونہ چھوڑ گئے۔

والدہ کا نام فاطمہ بنتِ اسد ہے جو ایمان بھی لائیں اور ہجرت سے سرفراز بھی ہوئیں۔

حضرت علیؓ کا پورا نسب علی ابن ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قُصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لُوی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد ابو طالب مکہ کے ذی اثر اور بڑے لوگوں میں سے تھے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبد المطلب کے بعد ان ہی کی آغوشِ شفقت میں پرورش پائی تھی، اور ان ہی کی زیرِ حمایت مکہ کے کفرستان میں کلمۂ حق کا اعلان کیا تھا، جس کے نتیجہ میں بے شمار تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، مگر اس کے باوجود زندگی کے آخری لمحے تک پیارے بھتیجے کی حمایت ونصرت کرتے رہے؛ لیکن افسوس شفیعِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہزار چاہنے کے باوجود دولتِ ایمان سے محروم رہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ محترمہ حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا ابو طالب کی چچا زاد بہن ہیں، گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ والداور والدہ دونوں کی طرف سے ہاشمی ہیں۔

حضرت فاطمہ بنتِ اسد رضی اللہ عنہا اپنے معصوم بھتیجے محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بڑا خیال رکھتی تھیں، حتی کہ آپ کو ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان کا بڑا اکرام کیا کرتے تھے، جب ان کی وفات ہوئی تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اپنا کرتا (کفن کے طور پر) پہنایا، قبر میں جا کر پہلے خود لیٹے پھر ان کو دفن کیا، یہ سب ان کی خدمات اور شفقت کا اعتراف اور ان کی عزت وتعظیم کا اظہار تھا۔ (سیر اعلام النبلاء للذہبی: ۲ / ۸۷ بحوالہ المرتضیٰ: ۳۹)

حلیۂ مبارک

آپ رضی اللہ عنہ نہایت گندم گوں، بڑی بڑی سرخی مائل سیاہ آنکھیں، پیٹ بڑا، اگلا حصہ بالوں سے عاری، قد تقریباً چھوٹا، داڑھی گھنی اور پھیلی ہوئی جس نے سینے

اور دونوں کندھوں کو چھپا رکھا تھا، سینے اور کندھوں پر بہت بال تھے، خوبرو، نوعمر اور آہستگی کے ساتھ زمین پر چلنے والے تھے۔ (تاریخ ابن کثیر ۷/۴۲۸)

حضرت علیؓ کی پیدائش و پرورش اور قبولِ اسلام

آپؓ بعثتِ نبوی سے دس سال قبل پیدا ہوئے، اس وقت رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف تقریباً تیس سال تھی، حضرت علیؓ کے والدِ محترم خواجہ ابوطالب عیال دار تھے؛ مگر مالدار و دولت مند نہ تھے، جس سے معاشی پریشانی لاحق ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ مکہ میں قحط پڑا، ابوطالب بڑے پریشان ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چچا کی پریشانی دیکھی اور حضرت عباسؓ سے کہا کہ آیئے! مصیبت کے وقت چچا کا ساتھ دیں، چناں چہ حضرت عباس نے حضرت جعفر کی کفالت اپنے ذمہ لی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو منتخب کیا، اس طرح حضرت علیؓ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش وتربیت میں آگئے، اور پھر کبھی جدا نہ ہوئے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خلعتِ نبوت عطا کیا گیا اس وقت حضرت علیؓ کی عمر شریف تقریباً دس سال تھی، حضرت علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت خدیجہؓ ہی کے گھر میں رہتے تھے، ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ایک مخصوص طریقے سے عبادت کرتے (نماز پڑھتے) دیکھا تو اس کے بارے میں پوچھ لیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید ورسالت کی دعوت دی، سلامتِ طبع کے جوہر سے فطرتاً آراستہ تھے، پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش وتربیت سے اس میں چار

چاند لگ چکے تھے، توفیقِ الٰہی شامل ہوئی، اور تھوڑے سے غور وفکر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعوت کو قبول کرلیا اور بالغ ہونے سے پہلے ہی ۸، ۹ یا ۱۰ سال کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوگئے۔

(تاریخِ طبری مترجم ۲ / ۳۱۳، البدایہ والنہایہ ۳ / ۲۴ بحوالہ المرتضیٰ ۵۱ - ۵۲ - سیر الصحابہ ۱ / ۲۵۰)

مکی زندگی اور ہجرتِ مدینہ منورہ

دعوتِ اسلام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معاونت

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نبوت کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ تھی کہ لوگوں کو توحید ورسالت سے واقف کرایا جائے، ابتدا میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چھپ چھپ کر خفیہ دعوتِ اسلام دیتے رہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ رہتے اور ہر قسم کی صحبتوں، خلوتوں اور دعوتِ اسلام کی مجلسوں کے رفیق ہوئے اور بازاروں میں گشت کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے شریکِ کار رہ کر اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ جاتے۔

خفیہ دعوتِ اسلام کے بعد علانیہ دعوتِ اسلام کا سلسلہ شروع ہوا، جس میں لوگوں کو جمع کرنے کے واسطے کھانے پینے وغیرہ کے انتظام کی ضرورت تھی، چناں چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چودہ یا پندرہ سال کی کم عمری کے باوجود بڑی تن دہی وچابک دستی سے دعوت کا بہترین نظم کیا اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مکمل تعاون کرتے ہوئے خاندان والوں کو بلوایا، دعوتِ طعام سے فارغ ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اہلِ خاندان کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ: اے بنو عبد

المطلب! بخدا میں تمہارے پاس دنیا وآخرت کی بہترین نعمت لے کر آیا ہوں، اس کو دل وجان سے قبول کرلو، اور میرا پورا پورا ساتھ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تکالیف ومشکلات کا سامنا کرنے کی بجائے منہ موڑ لو، اگر تم میرا تعاون کرو گے تو اس کا بدلہ بہت ہی بہتر ملے گا، یہ سُن کر کسی نے کچھ جواب نہیں دیا سوائے ایک بچّے کے، اُس نے خاندان کے سرکردہ حضرات کی موجودگی میں انتہائی بہادری سے کہا کہ:

''اگر چہ میں عمر میں سب سے چھوٹا، بیماری میں آشوبِ چشم کا شکار، شکل وصورت اور ہیئت میں دبلی پتلی ٹانگ اور بڑے پیٹ والا ہوں؛ لیکن میں آپ کا ہر طرح سے مصیبت کی ہر گھڑی میں ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس جوشیلے انداز میں خاندان کے بڑے بڑے لوگوں کے سامنے اتنی بڑی ذمہ داری اپنے چھوٹے سے سر پر لینے والے کوئی اور نہیں، بلکہ شیرِ خدا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ تھے، چھوٹے منہ سے بڑی بات سن کر اہلِ مجلس ٹھٹھا ومذاق اڑاتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ چودہ سالہ چھوکرا کیا کرے گا اور تمہاری مدد ونصرت کر کے کیا اکھاڑ لے گا؟ لیکن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن وڈیروں کی بات سے دل گرفتہ نہ ہوئے؛ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ٹھیک ہے تم میرے بھائی اور میرے وارث ہو۔ (تاریخِ طبری مترجم: ۸۹/۲)

ہجرت کی رات

اس طرح دعوتِ اسلام کا سلسلہ تقریباً تیرہ سال تک چلتا رہا؛ لیکن چند پاکیزہ فطرت ہستیوں کے علاوہ اکثریت دشمنی ومخالفت پر اَڑی رہی، ایذائیں

پہنچانے اور تکلیفیں دینے کا عمل نہ صرف جاری رہا؛ بلکہ ترقی کرتا رہا، مکہ کی سرزمین باوجود اپنی وسعتوں کے تنگ پڑ گئی، بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت کا حکم ملا، چوں کہ آپ صادق وامین سے جانے جاتے تھے، لہٰذا کفارِ مکہ بھی باوجود دشمنی وعداوت کے اپنی امانتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے پاس رکھتے تھے، چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کی رات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ارشاد فرمایا کہ: لوگوں کی امانتیں ان کے مالکوں کے حوالے کرکے مدینۂ منورہ ہجرت کرجانا اور ہم سے وہیں ملاقات کرنا، اتنا فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آیتِ کریمہ تلاوت کرتے ہوئے نکل گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یقینِ کامل تھا کہ زبانِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدینۂ منورہ میں ملنے کا حکم آچکا ہے؛ لہٰذا ملاقات یقینی ہے، اس لیے ننگی تلواروں کے سایے میں اطمینان سے بسترِ مبارک پر سو گئے۔

تقدیرِ علی کی جاگ اٹھی، ہجرت کی اندھیری رات آئی
اک مہرِ مبیں کے بستر پر اک نجمِ درخشاں سوتا ہے

صبح کفارِ مکہ نے گھر کے اندر جھانکا تو دیکھا کہ سر سے پیر تک چادر تانے کوئی آدمی بسترِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بڑے سکون سے سو رہا ہے، سمجھے کہ خود محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں، اندر داخل ہوئے، معلوم ہوا کہ حضور کے چچا زاد بھائی، ابو طالب کے فرزند: علی ہیں۔

ع ''علی بہ حکمِ شیرِ رسالت، نبی کے بستر پہ محوِ راحت''

بہادرانِ مکہ کو علی کی شجاعت اور اپنی غفلت پر بڑا غصہ آیا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر مقصد کی طرف چل پڑے، یہ آپ رضی اللہ عنہ کی دلیری و جواں مردی نہیں تو اور کیا ہے کہ تلواروں کے سایہ میں بڑے چین وسکون سے بسترِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آرام فرما رہے! ع تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں

پھر آپ رضی اللہ عنہ تین دن تک معاملات کی صفائی اور امانتوں کی سپردگی کرتے رہے، ان سب سے فارغ ہو کر ہجرت فرمائی اور قبا میں حضرت کلثوم بن ہدم کے مکان پر محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی، چند دن وہیں پر قیام فرمایا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مدینہ تشریف لے آئے۔

سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینۂ منورہ میں انصار ومہاجرین کے درمیان اخوت و بھائی چارگی کا اٹوٹ رشتہ قائم فرمایا جس میں علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اکیلے رہ گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رنج بھرے لہجے میں کہا: اے اللہ کے نبی! آپ نے میرا کسی سے رشتہ قائم نہیں کیا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سن کر آپ رضی اللہ عنہ کی دلجوئی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ تم رشتے میں میرے بھائی ہو!

کوئی کیا جان سکتا ہے کہ ان کا مرتبہ کیا ہے
علی میرے ہیں، میں ان کا شہِ ابرار کہتے ہیں

(طبقات ابن سعد: ۱۳ بحوالہ سیر الصحابہ ۲ / ۲۵۳۔۲۵۴)

نکاح اور غزوات میں شرکت

مدینہ ہجرت کرنے کے بعد جہاد کا حکم نازل ہوا؛ لہٰذا کفار کے ساتھ سب سے پہلا فیصلہ کن معرکہ بدر کے مقام پر بپا ہوا، جسے ''غزوۂ بدر'' کہا جاتا ہے۔

غزوۂ بدر

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس غزوہ میں تین اسلامی پرچم بنائے تھے، جن میں سے ایک حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ (تاریخ ابن خلدون، حصہ اول، باب: ۸۱/۳) چناں چہ مقامِ بدر کے پاس پہنچ کر دونوں لشکر آمنے سامنے صف باندھے کھڑے ہوگئے، زمانۂ قدیم سے جنگوں کے سلسلہ میں یہ دستور چلا آرہا تھا کہ عام جنگ شروع کرنے سے پہلے انفرادی مقابلے ہوتے اور اس سے نیک فالی لی جاتی، اس کے بعد عام لڑائی چھڑ جاتی، اسی دستور کے مطابق کفار کی طرف سے تین جنگ آزمودہ شہسوار: عتبہ بن ربیعہ اس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ اور اس کا بیٹا ولید نکلا، مجاہدینِ اسلام کے لشکر سے تین انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم نکلے، لیکن اُنھوں نے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ ہمارا مقابلہ تم لوگوں سے نہیں، اور بڑے تکبّر سے کہا کہ ہمارے ہم رتبہ آدمیوں کو بھیجو، دیکھتے ہیں ان میں کتنا دم ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ سنا تو مشکل وقت میں اپنے خاندان کے تین افراد کو مقابلہ کے لیے منتخب کیا، اس لیے کہ عتبہ شیبہ اور ولید کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ قریشی شہ سوار کس پایے اور طاقت کے جنگجو ہیں، لہٰذا خطرے کے وقت ایسے نازک موقعے پر

اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں ہی کو مقدم کیا، چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجاہدین کی صف کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: حمزہ اٹھو، علی اٹھو، عبیدہ بن حارث اٹھو، ارشاد سن کر یہ تینوں قریشی حضرات میدان میں آگے بڑھے، عتبہ نے پوچھا: کون؟ جواب دیا: ہم تم ہی میں سے ہیں، اتنا کہہ کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے شیبہ پر ایک زوردار حملہ کر کے ایک ہی وار میں جہنم رسید کر دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ولید بن عتبہ کو للکار کر زوردار تلوار کا ہاتھ مارا وہ بھی چند لمحوں میں خاک و خون میں لت پت ہو گیا، البتہ حضرت عبیدہ کا مقابلہ عتبہ سے ہوا جو میدانِ جنگ کا دھنی اور جنگجو قسم کا آدمی تھا، حضرت عبیدہ کو دیکھ کر ان کی طرف لپکا اور پے در پے کئی وار کیے، حضرت عبیدہ زخمی ہو گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو ایک ساتھ دونوں عتبہ پر حملہ آور ہوئے اور اسے بھی واصلِ جہنم کر دیا، اس کو نمٹا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کو زخمی حالت میں کندھے پر اٹھا لائے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچا دیا، اس کے بعد سپہ سالارِ اعظم محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام حملہ کا حکم دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اور بہت سارے کافروں کو قتل کیا، بالآخر مسلمان کامیاب ہوئے، اور مالِ غنیمت کے ساتھ ساتھ قیدی بھی پکڑ کر مدینہ واپس لوٹے۔

شہنشاہِ بطحیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح اسی سال ۲ھ میں شیرِ خدا حیدرِ کرّار حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود نکاح پڑھایا اور برکت کی دعا دی، پھر حضرت فاطمہ سے فرمایا کہ میں نے تمہارا

نکاح اہلِ بیت کے سب سے بہتر شخص کے ساتھ کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس مال وغیرہ کچھ نہیں تھا، صرف ایک زرہ تھی وہی آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فروخت کی اور جو رقم ملی اس سے مہر ادا کیا، چوں کہ آپ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہی رہتے تھے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مکان کرایہ پر لینے کا امر فرمایا، آپ رضی اللہ عنہ نے حکم کی تعمیل کی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چند مہینوں کے بعد رخصت ہو کر اسی گھر میں آئیں۔ (مزید تفصیل سیر و تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے)۔

اس کے بعد ۳ھ میں غزوہ اُحد پیش آیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جھنڈا حضرت مصعب بن عمیر کو دیا تھا، ان کے ہاتھ میں پرچم دیکھ کر مشرکین ان پر پل پڑے بالآخر شہید ہو کر گر گئے، جھنڈا بھی گرنے لگا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر جھنڈا گرنے سے بچا لیا اور پرچم لیے ہوئے بڑا سخت حملہ کر کے کفار کو تہِ تیغ کرنا شروع کر دیا، حضرت علی کو شجاعت سے لڑتے دیکھ کر کفار بکھر گئے، اس غزوے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کافی زخمی ہو گئے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ڈھال میں پانی بھر کر لاتے رہے اور حضرت فاطمہ اپنے ہاتھوں سے زخم صاف کرتی رہیں، خون بند نہیں ہوا تو چٹائی جلا کر راکھ زخم میں بھر دی گئی جس سے خون نکلنا بند ہو گیا۔ اس غزوہ میں ہر ایک کی زبان پر حضرت علی کی بہادری کے چرچے تھے۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ احد ۲/۸۹۹)

غزوۂ احد سے فارغ ہو کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۴ھ میں بنو نضیر کی طرف

متوجہ ہوئے، جنھوں نے بدعہدی کرکے کفارِ مکہ کا ساتھ دیا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس میں بھی پیش پیش تھے اور پرچمِ اسلام آپ رضی اللہ عنہ ہی کے پاس تھا۔ (سیر الصحابہ ۱/ ۲۵۸)

غزوۂ خندق

اس کے بعد ۵ھ میں غزوۂ خندق ہوا، دس ہزار کا لشکرِ جرّار مدینہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، درمیان میں خندق حائل تھی۔ ایک روز چند کافر گھوڑ سوار خندق پار کرکے مسلمانوں کی طرف آنکلے، حضرت علی رضی اللہ عنہ چند جانباز مجاہدین کے ساتھ آگے بڑھے، ادھر مشرکوں میں سے ایک شہ زور پہلوان عمرو بن عبدِ ودّ نے آگے بڑھ کر ھل من مبارز کا نعرہ لگایا، یہ بڑا بہادر اور شہسوار سمجھا جاتا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے سامنے آئے تو حقارت سے اُس نے منع کردیا، آپ رضی اللہ عنہ نے کہا میں تجھ سے ہی لڑوں گا یہ سن کر وہ غضبناک ہوگیا اور گھوڑے سے اتر کر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بڑا سخت حملہ کیا، آپ رضی اللہ عنہ نے بھی حملہ کا جواب دیا، دیر تک تلواریں ٹکراتی رہیں، بالآخر ذوالفقارِ حیدری نے اُسے واصلِ جہنم کردیا، عمرو بن عبدِوُدّ کو خاک وخون میں لت پت دیکھ کر بقیہ سوار سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

غرض کافی دن تک کفار محاصرہ کیے رہے؛ لیکن اہلِ ایمان کے استقلال وثابت قدمی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے بہادرانِ اسلام کے آگے ان کی ایک نہ چلی اور ایک رات زوروں کی آندھی چلی، خیمے اکھڑ گئے، دیگیں الٹ گئیں، پورے لشکر میں ہلچل مچ گئی، ادھر ایک صحابی نعیم بن مسعود ثقفی کی ذہانت سے ان میں باہمی

پھوٹ پڑ گئی، چناں چہ کفار ہزیمت کھا کر بھاگ کھڑے ہو، اس طرح یہ معرکہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ (سیرت ابن ہشام ۹۸/۲ بحوالہ سیر الصحابہ ۲۵۸/۱)

غزوۂ بنو قریظہ

غزوۂ خندق سے فرصت پا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام مجاہدین کے ساتھ بنو قریظہ کی طرف متوجہ ہوئے، بنو قریظہ کا اہل ایمان سے معاہدہ تھا کہ کسی لڑائی میں کفار کا ساتھ نہیں دیں گے؛ لیکن مشرکین کی اتنی کثیر تعداد دیکھ کر انھوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور مشرکین سے ساز باز شروع کر دی؛ اس لیے انہیں اس جرم کی سزا چکھانا ضروری تھا؛ لہٰذا اسی سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی کو علَم دے کر ان کی طرف بھیجا، حضرت علی بہت جلد وہاں پہنچ گئے، اوران کے قلعہ پر قبضہ کر کے اس کے صحن میں عصر کی نماز ادا کی۔ (سیر الصحابہ ۲۵۸/۱)

صلح حدیبیہ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عقیدت ومحبت

۶ھ میں صلحِ حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا، جس میں شرائطِ معاہدہ تحریر کرنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، حضرت علی آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا لکھو: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، سہیل بن عمرو نے کہا کہ یہ نیا کلمہ کیا ہے؟ میں اس کو نہیں جانتا، باسمک اللّٰھم لکھواؤ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہی لکھو، پھر فرمایا: لکھو یہ وہ شرائط ہیں جس پر اللہ کے رسول محمد نے سہیل سے صلح کی ہے۔ سہیل نے اس پر بھی اعتراض کر دیا کہ اگر ہم تم کو اللہ کا رسول مانتے تو تم

سے کیوں لڑتے، تم اپنا اور اپنے والد کا نام لکھواؤ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''محمد رسول اللّٰہ'' کا لفظ مٹا کر ''محمد بن عبد اللہ'' لکھنے کا امر فرمایا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت نے یہ گوارا نہیں کیا اور فرمایا کہ: حضور! مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے نافرمانی نہیں؛ بلکہ حضور سے حد درجہ محبت وعقیدت کا ایک نمونہ ہے کہ رسول اللہ کا لفظ بھی مٹانا پسند نہیں کیا، چناں چہ حضور نے بھی بُرا نہیں مانا؛ بلکہ خود ہی پوچھ کر مٹا دیا، اور ''محمد بن عبد اللہ'' لکھوا دیا۔

(تاریخ ابن خلدون ۱/ ۱۳۸-۱۳۹)

غزوۂ خیبر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت وشجاعت

صلح حدیبیہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیبر کی طرف متوجہ ہوئے جہاں کے یہودیوں کی اسلام دشمنی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی، چناں چہ ۷ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جاں نثاروں کے ساتھ خیبر پہنچے، خیبر میں آٹھ بڑے اور مضبوط قلعے تھے، تمام قلعے آسانی سے فتح ہو گئے؛ لیکن آخری قلعہ ''قموص'' تھا جس کا سردار مرحب نامی یہودی جنگجو اور آزمودہ کار سپہ سالار تھا، اس قلعہ کو فتح کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سالارِ لشکرِ اسلامی بنا کر روانہ فرمایا؛ لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں قلعہ فتح نہ ہو سکا، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی زور آزمائی کی؛ لیکن فتح نہ کر سکے، اس کو فتح کرنے کے لیے دس دن کا محاصرہ کرنا پڑا، اور اخیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا، تفصیل درجِ ذیل ہے:

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوۂ خیبر کے موقعہ پر جناب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ عظیم الشان جملہ ارشاد فرمایا جس کی تمنا ہم گروہِ صحابہ میں سے ہر صحابی کرتا تھا اور ہر سچے پکے مسلمان کی یہی تمنا ہوا کرتی ہے، چناں چہ حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”لأعطين هذه الراية غداً رجلا يفتح الله على يده يحب الله ورسوله ويحبه الله ورسوله“۔ یعنی آئندہ کل میں ایسے شخص کو پرچم دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ ورسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں، دوسرے دن تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اپنی گردنیں تانے اپنے اپنے نام کا انتظار کرنے لگے، اور ہر ایک کی خواہش تھی کہ جھنڈا اُسے دیا جائے؛ تاکہ یہ پروانۂ محبت اس کے نام ہوجائے؛ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافِ توقع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا، آپ رضی اللہ عنہ وہاں موجود نہ تھے اس لیے جواب دیا گیا کہ علی آشوبِ چشم کے شکار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بُلا بھیجا، خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا لعابِ مبارک آنکھ میں لگایا اور دعا فرمائی، جس سے بیماری جاتی رہی، اس کے بعد زندگی بھر کبھی آنکھ میں شکایت نہ ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پرچم عطا فرمایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ان سے قتال کرکے ہماری طرح مسلمان بنالوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”أنفذ على رسلك حتى تنزل بساحتهم ثم ادعهم إلى الإسلام وأخبرهم بما يجب عليهم من حق الله فيه، فوالله لأن يهدي الله بك رجلا واحدا خير لك من أن يكون لك حمر

النعم". یعنی یوں ہی چلے جاؤ، ان کے میدان میں اتر کر پہلے انھیں اسلام کی دعوت دو، اورانھیں بتاؤ کہ ان پر اللہ کا کیا حق واجب ہے، خدا کی قسم! اگر تمہارے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو بھی ہدایت عطا فرمادے تو تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر اور بڑھ کر ہے۔ (بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۂ خیبر ۹۳۰/۲)

اتنا سن کر حضرت علیؓ جھنڈا لیے آگے بڑھے اور لڑائی شروع ہوئی، قلعہ کا پھاٹک تن تنہا حضرت علیؓ نے اکھاڑ دیا اور اسے ڈھال کے طور پر استعمال کرنے لگے، قلعہ کا سردار مرحب یہودی بھی پختہ کار سپاہی تھا، حضرت علیؓ کو دیکھ کر تکبر وبڑائی اور بہادری جتانے کے لیے رجزیہ شعر پڑھتے ہوئے حملہ آور ہوا، حضرت علی پہلے ہی سے تیار تھے، آپؓ نے بھی رجزیہ شعر "أنا الذي سمتني أمي حيدرة"، (میں وہ ہوں کہ میرا نام میری ماں نے حیدر رکھا ہے)

كليت غايات كريه المنظرة	أو فيهم بالصاع كيل السندرة

جھاڑی کے شیر کی طرح مہیب اور ڈراؤنا، میں دشمنوں کو نہایت آسانی سے جلد ہی قتل کر دیتا ہوں۔

پڑھتے ہوئے دفاع کیا، اور ساتھ ہی تلوار کا ایسا زوردار وار کیا جس سے مرحب بچ نہ سکا اور سیدھا جہنم میں جا پہنچا، اس طرح شیرِ خدا حضرت علی مرتضیٰ کے ہاتھوں بہ آسانی خیبر کا قلعہ فتح ہوگیا۔

(بخاری، کتاب المغازی، ۹۳۰/۲۔ سیرت علی بن ابی طالب، عربی: ۱۰۱)

حضرت علیؓ کے اس بہادرانہ کارنامہ کو دیکھ کر شاعر بے ساختہ کہہ اٹھا:

علی مرتضی کو حیدرِ کرار کہتے ہیں		سبھی یہ بات کہتے ہیں؛ نہیں دو چہار کہتے ہیں
شجاعت میں بڑے مشہور ہیں وہ فاتحِ خیبر		انہیں شیرِ خدا، جبار کی تلوار کہتے ہیں

فتحِ مکہ

ادھر مسلمان خیبر سے کامیاب ہوکر واپس مدینہ لوٹے اور ادھر معلوم ہوا کہ اہلِ مکہ نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے، چناں چہ جناب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خفیہ طور پر تیاریوں کا حکم دیا؛ لیکن صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ نے جنگ کی پوری تفصیل لکھ کر ایک عورت کے ہاتھوں مکہ میں اپنے اقارب کے لیے روانہ کردی، ادھر وحی کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع مل گئی آپ نے اس عورت کو پکڑنے کے لیے صحابہؓ بھیجے۔ روایت میں ہے حضرت علیؓ فرماتے ہیں: مجھے، زبیرؓ اور مقدادؓ کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روانہ کیا اور ہدایت کی کہ مکہ مکرمہ کے راستے پر چلے جاؤ، جب تم روضۂ خاخ پر پہنچو گے تو وہاں تمہیں اونٹ پر سوار ایک عورت ملے گی، اس کے پاس ایک خط ہے، اس میں مکہ پر چڑھائی کی تفصیل درج ہے، تم اس سے وہ خط لے لینا، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ: ہم روانہ ہوئے، ہمارے گھوڑے ہوا سے باتیں کرتے اڑے جارہے تھے، جب گلستانِ خاخ پر پہونچے تو واقعی ہمیں وہاں ایک عورت اونٹ پر سوار مکہ کی طرف جاتی ہوئی ملی، ہم نے روک کر اس سے کہا: خط نکالو، وہ انجان بن کر کہنے لگی کہ میرے پاس

کوئی خط نہیں ہے، ہم نے کہا: خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ صداقت سے کبھی غلط اور جھوٹ نکل نہیں سکتا، خط تیرے پاس ہی ہے، نکال کر دے؛ ورنہ ہم تجھے ننگا کر دیں گے، اس عورت نے ۔جس کا نام ''مزینہ کنوذ'' تھا۔سوچا کہ اگر میں خط نہ دوں گی تو واقعی یہ لوگ اپنی بات پر عمل کر دیں گے جس سے میری رسوائی اور ذلتی ہوگی، چناں چہ اس نے اپنی چوٹی میں سے خط نکالا اور ہمارے حوالے کر دیا، ہم خط کے ساتھ اس عورت کو بھی گرفتار کر کے دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لے آئے۔قصہ مختصر! اس اہم مہم کے لیے بھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہِ انتخاب جن بہادرانِ اسلام پر پڑیں ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

(تاریخ ابن خلدون: ۱ / ۱۵۸، نصر الباری شرح البخاری ۸ / ۳۳۲)

غرض ۸ ھ میں معمولی سی جھڑپ کے بعد مکۃ المکرمہ فتح ہوا، فاتحِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت بلال، علی اور ابن عباس وغیرہم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ کعبۃ اللہ میں داخل ہوئے، تمام بتوں کو توڑ ڈالا، ایک بُت تھوڑا اوپر تھا جہاں تک بہ آسانی ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: مجھے کاندھے پر اٹھاؤ، حضرت علی رضی اللہ عنہ جسمِ اطہر کا بار نہ اٹھا سکے، یہ دیکھ کر محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اچھا تم میرے کاندھے پر چڑھ کر اس کو بھی گرادو؛ تاکہ اس وحدت کدہ کا گوشہ گوشہ بتوں کی گندگیوں سے بالکل پاک صاف ہوجائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ بحکمِ نبی شانۂ اقدس پر چڑھے اور اس کو بھی جڑ سے اکھاڑ دیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے

ملیامیٹ کردیا۔ (مستدرک حاکم بحوالہ سیر الصحابہ ۱/ ۲۶۲)

غزوۂ حنین اور آپ رضی اللہ عنہ کی فراست و بہادری

فتحِ مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبیلۂ ہوازن وثقیف کی طرف متوجہ ہوئے، حنین کے مقام پر جنگ ہوئی، حنین چوں کہ ایک وادی تھی، اس میں قبیلۂ ہوازن کے تیرانداز اور گھوڑ سوار دستے گھات لگا کر بیٹھ گئے، اہلِ ایمان کا لشکرِ جرار جب ان کی زد میں آیا تو انہوں نے تیراندازی کے ساتھ ہی تلوار بازی بھی شروع کردی اور زوردار حملہ کردیا، جس سے لشکرِ اسلام کے اگلے حصے میں بھگدڑ کی سی کیفیت ہوگئی، کچھ نئے مسلمان بھی تھی جنہوں نے کافی ہلچل مچائی، یہ صورت حال دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک آواز لگائی؛ لیکن آواز مبارک ہر ایک کو پہنچ نہ سکی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک طرف کھڑے ہوگئے، آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کی ایک جماعت تھی، آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: تمام لوگوں کو آواز دے کر جمع کرو؛ چناں چہ تمام لوگ حضرت عباس کی آواز پر مجتمع ہوگئے، اب جو پلٹ کر حملہ کیا تو کفار بھاگ کھڑے ہوئے۔ غرض اس غزوہ میں بھی حضرت علی کا کردار نمایاں رہا، آپ رضی اللہ عنہ دشمنوں کا حملہ اور اسلامی لشکر میں بھگدڑ و پسپائی دیکھ کر پشت دکھانے کی بجائے ثابت قدم رہے اور دشمنانِ اسلام کے لہو سے شمشیرِ حیدری کی پیاس بجھائی۔ (سیرت ابن ہشام: ۲/ ۲۶۷، بحوالہ سیر الصحابہ ۱/ ۲۶۳)

اس غزوہ میں ایک اہم واقعہ پیش آیا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت ومہارت

کا غمّاز ہے، وہ یہ کہ قبیلۂ ہوازن کے لشکر میں سرخ اونٹ پر سوار، ہاتھ میں سیاہ جھنڈا لیے ایک شخص نے نیزہ بلند کیا، جس کو دیکھ کر قبیلۂ ہوازن کے تمام لشکری اس کے پیچھے چل پڑے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر اپنی جنگی مہارت اور طویل تجربے سے بھانپ لیا کہ یا تو یہ بھاگ رہا ہے یا پھر نئے سرے سے حملہ کی تیاری کر رہا ہے، چناں چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئے، اور بڑی چالاکی سے اس کو اونٹ سے نیچے گرالیا، تھوڑی دیر مقابلہ ہوا، بالآخر ذوالفقارِ حیدری نے اس کے دو ٹکڑے کردیے، اس طرح مسلمان فاتح کہلائے۔ (سیرت علی ابن ابی طالب عربی، الفصل الاول: ۱۰۵، ۱۰۶)

غزوۂ تبوک میں شمولیت کے لیے اضطرارِ حیدری

۹ھ میں غزوۂ تبوک واقع ہوا، یہ غزوہ انتہائی سخت گرمی اور آزمائش کے موسم میں پیش آیا، کھجوریں پک چکیں تھیں، اہلِ ایمان کے لیے امتحان کی گھڑی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کو مدینہ ہی میں رہنے کا حکم دیا جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہلِ بیت کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑا جس پر منافقین نے عار دلائی اور طعن و تشنیع کے زہر آلود تیر برسائے، جس کو حضرت علی کی غیرت مند طبیعت برداشت نہ کرسکی، ابھی مجاہدین کا قافلہ زیادہ دور نہیں گیا تھا؛ اس لیے فوراً خدمتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پہنچ گئے اور منافق کی شرارت کی اطلاع دیتے ہوئے شکایت کی، آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”ألا ترضیٰ أن تکون مني بمنزلة هارون من موسیٰ إلا أنه لیس نبي بعدي“ کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ میری نسبت تمہارے ساتھ وہی ہو جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھی؛ مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ (بخاری، کتاب المغازی ۲/ ۶۳۳)

اعلانِ عام کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب

تبوک سے واپسی کے بعد شفیعِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر مکۂ مکرمہ روانہ کیا، اسی زمانہ میں سورۂ برأت نازل ہوئی جس میں چند احکام ایسے تھے جو علی الاعلان سنانے ضروری تھے، چوں کہ خون اور مال کے معاہدوں اور نئے احکام سنانے کے سلسلے میں عرب کا دستور یہ تھا کہ یا تو خود بادشاہ اعلان کرے یا اس کے خاندان کا کوئی فرد اطلاع دے، خاندان سے باہر کے کسی آدمی کا اعلان معتبر نہیں سمجھا جاتا تھا؛ اس لیے اس مرتبہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظرِ انتخاب حضرت علی رضی اللہ عنہ پر پڑی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور مکہ میں علی الاعلان یہ احکام سنا دو کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا، کوئی شخص بیت اللہ کا ننگے ہو کر طواف نہیں کرے گا، جن لوگوں کے ساتھ میعادی معاہدہ ہے وہ اپنی مدت تک باقی رہے گا، اس کے بعد تجدید نہیں ہوگی، جن کے ساتھ عہد و پیمان نہیں یا غیر میعادی معاہدہ ہے ان کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے، اس کے بعد کسی بھی وقت ان پر حملہ ہوسکتا ہے۔ (تحفۃ القاری شرح البخاری ۲/ ۴۵۶)

چناں چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فریضہ بھی بہ حسن وخوبی انجام دیا۔

یمن میں اشاعتِ اسلام کی مہم اور حجۃ الوداع میں شرکت

حج سے واپس آنے کے بعد حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تبلیغِ دین و اشاعتِ اسلام کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا، جس کا واقعہ اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پہلے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بغرضِ اشاعتِ اسلام روانہ کیا تھا، حضرت خالد چھ مہینے تک ٹھہرے، لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتے رہے؛ لیکن کسی نے کفر سے آلودہ قلبِ سیاہ کو نورِ ایمان سے منوّر کرنا منظور نہیں کیا، تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا اور فرمایا کہ خالد بن ولید کو واپس کر دینا، حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن پہنچے اور آس پاس کے لوگوں کو جمع کیا، پہلے ان کو اللہ جل شانہٗ کے عذاب وعتاب اور یومِ قیامت کی پکڑ سے ڈرایا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا حال بتایا، اس طرح اپنے حکیمانہ اسلوب سے انہیں اسلام کا گرویدہ بنالیا، بفضلِ الٰہی انہیں حقّانیتِ اسلام کا پتہ چل گیا اور پورا قبیلۂ ہمدان مسلمان ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بذریعۂ تحریر اس واقعہ کی اطلاع دربارِ رسالت میں پہنچادی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اللہ جل جلالہٗ کی بارگاہِ عالی میں سجدۂ شکر یہ ادا کیا اور تین مرتبہ ”سلام علی همدان“ فرمایا۔ (تاریخِ ابن خلدون: ۱/ ۱۹۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن ہی میں مقیم تھے کہ اطلاع ملی کہ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حجۃ الوداع کے لیے مدینۂ منورہ سے روانہ ہو چکے ہیں، آپ رضی اللہ عنہ بھی ہدی کے جانور لے

کریمن سے چلے اور مکۃ المکرمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا: علی حج کے لیے آئے ہو یا عمرہ کے لیے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قلبی لگاؤ اور دلی محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: اے اللہ کے نبی! میں نے تو آپ کے احرام باندھنے کی طرح احرام باندھا ہے یعنی آپ نے جس نیت سے احرام باندھا ہے میں نے بھی اسی نیت سے احرام باندھا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری ووفات
اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیمارداری اور تجہیز وتکفین میں شرکت

حج سے فارغ ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس مدینہ کے لیے نکلے، ہلکا ہلکا سر میں درد شروع ہوا اور بیماری وکمزوری محسوس ہوئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سنا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تیمارداری اور دیکھ بھال میں مصروف ہوگئے؛ لیکن دین مکمل ہو چکا تھا، اور وقت آچکا تھا کہ ایک فرماں بردار بندہ اپنے پروردگار کی دی ہوئی ذمہ داری پورا کرکے اس کے پاس انعام وصول کرنے کے لیے واپس چلا جائے، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس یا تیرہ دن علیل رہے، جس میں حضرت علی وحضرت فاطمہ کے ساتھ برابر خدمت میں لگے رہے اور اپنی استطاعت بھر خدمت میں کوئی کمی نہیں ہونے دی، آخر نوشتۂ تقدیر غالب آیا، فرشتۂ اجل نے اجازت چاہی، اور محسنِ انسانیت سرورِ کائنات فخرِ موجودات خاتم النبیین والمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللھم الرفیق الأعلی کہتے ہوئے دنیائے فانی پر ابدی آخرت اور لقائے رب کو ترجیح دی۔

چوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ترین عزیز اور اہلِ بیت میں سے تھے، اس لیے تجہیز و تکفین کے تمام مراحل آپ رضی اللہ عنہ ہی کے دستِ بابرکت سے انجام پائے، غسل کا موقعہ آیا تو آپ ہی نے ابتدا کی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ اطہر کو اپنے سینے سے لگایا، قمیص مبارک کے اوپر سے ہی ہاتھ مَل کر غسل دیا، آپ رضی اللہ عنہ کے سوا غسل دینے والے دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ لی تھیں؛ تاکہ جسمِ اطہر پر نظر نہ پڑے۔ غسل کے بعد کفن دیا گیا جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے۔ اس کے بعد جماعت کے بغیر تنہا تنہا نماز پڑھی گئی۔ نماز میں کیا پڑھا جائے؟ اس کے بارے میں پوچھا گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: آیتِ کریمہ: إن اللہ وملائکتہ یصلون علی النبي درود شریف اور "لبیک اللھم ربنا وسعدیک" پڑھو۔ (اصح السیر :۵۴۱-۵۴۲) تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جب نماز سے فارغ ہوگئے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت قثم ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مل کر جسمِ مبارک کو قبر شریف میں اتارا۔ اس طرح حضرت علی ابتدا سے لے کر انتہا تک حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے اور رفاقت کا حق نبھانے کی ہر ممکن سعی فرما کر اپنے وعدے کو پورا کر دکھایا۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت
اور ان کے دورِ خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام

ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے، اور اُدھر

ثقیفۂ بنو ساعدہ میں اکابر صحابہؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بالاتفاق خلیفۂ اول وجانشینِ رسول مان کر ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی، حضرت علیؓ اس وقت موجود نہ تھے، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدائی کا سب سے زیادہ غم حضرت فاطمہؓ اور خود ان کو بھی تھا، جس کی وجہ سے حضرت فاطمہؓ بیمار رہنے لگیں، لہٰذا حضرت علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدفین وغیرہ سے فارغ ہوکر حضرت فاطمہؓ کی دلجوئی و تیمارداری میں لگ گئے، اسی میں چھ ماہ کا عرصہ بیت گیا اور حضرت فاطمہؓ اسی بیماری وغم میں گھُل کر تقریباً چھ مہینے کے بعد عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف رحلت فرما گئیں، تب حضرت علیؓ کو موقعہ ملا اور مسجدِ نبوی میں جا کر خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

حضرت علیؓ نے چھ مہینے کے بعد بیعت کی تھی، اس بات کو لے کر بہت سارے حضرات نے من مانی باتیں گھڑ کر اپنی طرف سے مختلف روایات کا حوالہ دے ڈالا، جس کو الدکتور علی محمد الصّلابی نے اپنی کتاب بہ نام ''سیرۃ علی بن أبي طالب'' میں ضعیف و بے بنیاد قرار دیا ہے؛ لہٰذا جو صحیح روایت اور واقعہ کی حقیقت ہے ان ہی کے حوالے سے نقل کی جاتی ہے، چناں چہ علامہ علی محمد الصلابی فرماتے ہیں کہ:

حضرت علیؓ و حضرت زبیر ابن عوامؓ کی خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دستِ مبارک پر بیعت کے سلسلے میں تاخیر کے بارے میں بہت ساری خبریں وروایات وارد ہوئی ہیں؛ لیکن یہ روایات درست و صحیح نہیں، صحیح سند کی روایتیں یہ

بتلاتی ہیں کہ حضرت علیؓ وزبیرؓ دونوں نے اول مرحلہ ہی میں بیعت کرلی تھی؛ لیکن تیمارداری وکسی مجبوری کی بنا پر ان کی اور خلیفۂ اول کی آپس میں ملاقات نہ ہوسکی، جس کی وجہ سے غلط باتیں عام ہونے لگیں؛ چناں چہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے پردہ فرما گئے تو تمام صحابہؓ مسجدِ نبوی میں جمع ہوگئے، انصار کے خطبا وامرا کھڑے ہوئے اور سقیفۂ بنوساعدہ میں بیعت وغیرہ کا ذکر کیا۔ راوی فرماتے ہیں کہ: اپنی بات پوری کر کے انصار واپس چلے گئے، اس کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ منبرِ رسول پر کھڑے ہوکر مجمعِ عام پر ایک نگالی ڈالی، حضرت علیؓ نظر نہیں آئے، دریافت کیا، چناں چہ کچھ انصاری صحابی حضرت علیؓ کو مسجد نبوی میں لے آئے، خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت علیؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے رسولِ خدا کے چچا زاد برادر! اے دامادِ نبی! کیا تم مسلمانوں کے درمیان اختلاف وانتشار پیدا کرنا چاہتے ہو؟ حضرت علیؓ نے یہ سن کر جواب دیا: بہ خدا! میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا؛ بلکہ میں تو اتحاد واتفاق کی تعلیم دیتا ہوں؛ لہٰذا اے جانشینِ رسول وخلیفۂ نبی! کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیجیے! میں مجمعِ عام کے سامنے دوبارہ بیعت کرتا ہوں، اتنا کہہ کر حضرت علیؓ آگے بڑھے اور بیعت کرلی۔ اس کے بعد خلیفۂ اول نے دوبارہ مجمعِ عام پر ایک نظر ڈالی، حضرت زبیر ابن عوامؓ کو موجود نہ پاکر لوگوں سے ان کے متعلق سوال کیا، یہاں تک کہ لوگ ان کو بھی لے آئے، خلیفۂ

اول نے وہی جملے حضرت زبیر ابن عوام رضی اللہ عنہ کے سامنے دہرائے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسا ہی جواب دیا۔ اس طرح اہلِ بیت کے دونوں حضرات نے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کر لی۔ (مسلم ۲/ ۹۲۔

المستدرک ۳/ ۷۶۔ السنن الکبریٰ ۸/ ۱۴۳ بہ حوالہ سیرۃ علی ابن أبی طالب عربی الفصل الثانی: ۱۱۹، ۱۲۰)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو چھوڑ نہیں دیا؛ بلکہ عین اپنی روایتی وخاندانی شرافت، عالی ظرفی اور بے داغ خلوص وصداقت کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ان کے معاون ومددگار رہے، خلیفۂ اول کے بہترین مشیر وخیر خواہ ثابت ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے اتحاد واتفاق اور خلافت کی کامیابی سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہ تھی، جس کے لیے امیر المؤمنین کو مفید مشوروں سے نوازتے تھے، مرتدین کا فتنہ اٹھا تو خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خود اونٹنی پر سوار ہو کر ان سے قتال کرنے کے لیے نکلے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کی اونٹنی کی لگام پکڑ لی اور کہا اے خلیفۂ رسول! کدھر جا رہے ہیں؟ میں آپ سے وہی کہتا ہوں جو احد کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا وہ یہ کہ اپنی تلوار نیام میں رکھو اور ہم سب کو اپنی دائمی جدائی کا صدمہ نہ دو اور مدینہ واپس جاؤ، بخدا اگر آپ کو کوئی زخم پیش آیا تو اسلام کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے بکھر جائے گا، چناں چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بات سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ واپس ہو گئے۔

(البدایۃ والنہایۃ: ۶/ ۳۱۴۔ ۳۱۵ بحوالہ المرتضیٰ: ۱۵۰)

غرض حضرت ابوبکرؓ خلافت کے تمام کاموں میں آپؓ سے مشورہ لیتے تھے، اورآپؓ بھی بڑے خلوص وحسنِ نیت سے اپنی گراں قدر رائے سے خلیفۂ وقت کی بھرپور مدد کیا کرتے تھے۔

حضرت علیؓ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں

حضرت علیؓ کی عمر شریف اس وقت تقریباً پینتیس برس رہی ہوگی جب خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ خلیفۂ ثانی بنائے گئے، حضرت عمرؓ بھی آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے، اورامورِ خلافت کے چھوٹے بڑے تمام کاموں کے بارے میں برابر رہنمائی حاصل کرتے اور آپؓ کی رائے دریافت کرتے، حضرت علیؓ بھی نہایت مخلصانہ ودوستانہ مشورہ دیا کرتے تھے، خلیفۂ ثانی وحضرت علیؓ میں بڑا گہرا دوستانہ تھا۔ ایک مرتبہ صدقہ کے اونٹ لائے گئے، خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے کھڑے حضرت عثمان کو اِن اونٹوں کے بارے میں تفصیلات لکھارہے تھے، حضرت علیؓ آئے اور حضرت عثمانؓ سے کہا کہ قرآنِ کریم میں آیا ہے: يأبت استأجره، إن خير من استأجرت القوي الأمين (قصص:٢٦) پھر خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: هذا القوي الأمين یہ ہیں وہ جن کو قوی اورامین کہا جائے گا۔

(الکامل فی التاریخ لابن اثیرج: ٣/ ٥٥-٥٦ بحوالہ المرتضی: ١٦٩)

یہ حضرت علیؓ کا حضرت عمرؓ سے دوستانہ تعلق نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ پر

خلیفۂ ثانی کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس کے دور دراز سفر پر گئے تو اپنی جگہ خلافت کی ذمہ داریاں آپ رضی اللہ عنہ ہی کے سپرد کر گئے، نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی حضرت امِ کلثوم، خلیفۂ ثانی کے نکاح میں دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ مخلصانہ خدمات، اور خلافت کے امور کی دیکھ ریکھ کرنے کے سلسلے میں مر مٹنے کا جذبہ دیکھ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام سرِ فہرست رکھا؛ تاکہ مشکل وقت میں تمام مسلمان اختلاف وانتشار کے بہ جائے ان حضرات کے مشوروں پر عمل کر سکیں۔

خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتبہ اور خلیفۂ ثالث کی اطاعت

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے انتقال کر جانے کے بعد خلافتِ اسلامیہ کی باگ ڈور حضرت عثمان بن عفان کے ہاتھ میں آئی، خلیفۂ ثالث بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے اور مشوروں سے فائدہ اٹھاتے رہے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شیخین کی طرح نہایت مخلصانہ ودوستانہ مشوروں سے خلیفۂ ثالث کی بھر پور نصرت کرتے رہے: حتی کہ فسادیوں نے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے جگر پاروں کو ان کی حفاظت کے لیے مقرر کر رکھا تھا اور بعد میں خود بھی تشریف لے گئے تھے؛ لیکن قاتلین گھر کی پچھلی دیوار سے کود کر اندر گھس گئے اور بڑی بے دردی وبے رحمی سے خلیفۂ ثالث، نائبِ رسول حضرت عثمان بن

عفان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فسادیوں کو بہت روکا؛ لیکن قاتلوں نے دامادِ رسول، شوہرِ بتول رضی اللہ عنہا کی بھی توہین کر ڈالی، اور گھر میں جانے نہ دیا۔

(سیرۃ علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ عربی: ۱۵۵، ۱۶۰)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے زمانۂ خلافت میں موجودہ ترتیب پر قرآن کریم مرتب کیا گیا، چناں چہ اس مبارک اقدام کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: اے لوگو! عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ناانصافی سے کام نہ لو، تم کہتے ہو کہ انھوں نے مصاحف میں ردّ و بدل کر دیا ہے، خدا کی قسم! انھوں نے جو طرزِ عمل بھی اختیار کیا وہ صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں تھا، اور ان کو ان کی تائید حاصل تھی، اگر میں عثمان کی جگہ پر ہوتا تو میں بھی وہی کرتا جو انھوں نے مناسب سمجھا۔

(البدایہ والنہایۃ ۷ / ۲۱۸ بہ حوالہ المرتضیٰ ۲۰۴)

یہ جملہ خلیفۂ ثالث کی اطاعت و پیروی پر دال نہیں تو اور کیا ہے!!!۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت

حضرت عثمان کے زمانۂ خلافت ہی میں فتنہ وفساد شروع ہو چکا تھا، لہٰذا خلیفۂ ثالث کی شہادت کے بعد اس میں مزید اضافہ ہی ہوتا گیا جسے دور کرنے اور ختم کرنے کے لیے جلد از جلد خلیفۃ المسلمین کا مقرر کرنا ضروری تھا، اُس نازک وقت میں لوگوں کی نگاہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر آ کر ٹھہریں، اگرچہ آپ رضی اللہ عنہ اس بڑے منصب اور عظیم ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے؛ لیکن لوگوں نے

اور بطورِ خاص ان مفسدوں نے جن کے ہاتھ خونِ عثمان سے رنگے ہوئے تھے، آپ رضی اللہ عنہ کو خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے پر مجبور کیا۔ منصبِ خلافت سنبھالتے ہی آپ رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے ایک بلیغ خطبہ دیا، جس میں لوگوں کو دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی دوامی کے بارے میں بتایا، مسلمانوں کے حقوق کی پاسداری کی تلقین کی، ترغیب وترہیب کی آیتیں اور احادیثِ مبارکہ سنائیں، اور اتحاد واتفاق کی تعلیم دی۔ (البدایہ والنہایۃ ۷/۲۲۷، ۲۲۸ بہ حوالہ المرتضیٰ: ۲۳۰)

یہ ایسا دور تھا جس کو اسلامی تاریخ کا انتہائی نازک دور کہنا چاہیے، اختلاف وانتشار اور بدامنی کا بازار گرم تھا، اسی کے ساتھ ہی قاتلینِ عثمان سے قصاص لینے کا مطالبہ بھی شروع ہوگیا، لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے یہ صورتِ حال دیکھ کر سب سے پہلے قاتلینِ عثمان کے متعلق پتہ لگانے کا حکم دیا، تلاش وجستجو کے باوجود قاتلینِ عثمان کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے خلافتِ عثمانی کے تمام گورنروں کو معزول کرکے اپنے گورنر بھیجنے کا حکم دیا، چناں چہ حضرت سہیل بن حنیف رضی اللہ عنہ کو ملکِ شام کی گورنری کا پروانہ دے کر روانہ کیا جہاں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ پہلے سے گورنر تھے؛ لیکن حضرت سہیل کو مقامِ تبوک سے واپس آنا پڑا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وجہ دریافت کی تو جواب دیا کہ راستے میں ملکِ شام کے چند سوار ملے تھے، جنھوں نے کہا کہ ملکِ شام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون آلود کُرتا پہنچ چکا ہے اور لوگ قاتلینِ عثمان

سے قصاص لینے کے لیے سامانِ حرب وآلاتِ جنگ تیار کر رہے ہیں۔

جنگ جمل اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کردار

آپ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں کفار سے جہاد تقریباً موقوف رہا، جس کی وجہ سے اسلامی مملکت کی حدود میں اضافہ نہ ہوسکا؛ البتہ داخلی فتنوں کو مٹانے میں آپ نے بڑا اہم رول ادا کیا، جن میں فتنۂ خوارج سب سے خطرناک تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں تین بڑی جنگیں ہوئیں: جنگِ جمل، جنگِ صفین اور جنگِ نہروان آخری جنگ خارجیوں سے ہوئی، جس کو قابلِ تحسین کہا گیا ہے جس کے متعلق بعض حدیث میں پیشین گوئی اور پسندیدگی کے کلمات بھی وارد ہوئے ہیں؛ البتہ پہلی دو جنگ اپنوں سے ہوئی جس کے لیے فریقین راضی نہ تھے۔ بہت سارے محتاط حضرات ان لڑائیوں سے ہٹ کر دور چلے گئے تھے جن کو ''قاعدین'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

پہلی لڑائی جمل کے نام سے بصرہ کے قریب ہوئی، بربنائے احتیاط یہاں وہ بات نقل کی جارہی ہے جس کو امام اہلِ سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ: یہ لڑائی جمادی الاخریٰ ۳۶ھ میں ہوئی، جس کا صحیح پس منظر یہ ہے کہ: حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ جب بلوائیوں کے جبر سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر چکے تو بہ اجازتِ خلیفہ مدینہ چل دیے۔ امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس سال حج کو گئی ہوئی تھیں اور اس وقت تک مکۂ مکرمہ ہی میں مقیم تھیں، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ

وزبیرؓ نے ساراواقعہ ان سے جا کر بیان کیا کہ حضرت عثمانؓ شہید کردیے گئے ہیں اور بلوائیوں نے لوگوں پر جبر کرکے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنا کر بیعت کرائی ہے اور اس وقت مدینۂ منورہ میں سخت فتنہ برپا ہے، آپ ام المؤمنین ہیں، آپ کی پناہ میں مسلمانوں کو امن ملے گا، آپ ایسی کوشش کیجیے کہ کسی طرح یہ فساد دور ہو، حضرت علیؓ مصلحت اس میں سمجھتے ہیں کہ ابھی قاتلانِ عثمان سے قصاص لینے میں سکوت کیا جائے، حالاں کہ اس سکوت سے بلوائیوں کا زور بڑھتا جارہا ہے، حضرت علیؓ کا کہنا یہ ہے کہ پہلے تمام مسلمان بیعت کرکے ایک خلیفہ کے ماتحت جمع ہوجائیں اس کے بعد بہ آسانی بلوائیوں کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے ان جھگڑوں میں پڑنے سے انکار کیا، حضرت طلحہؓ وزبیرؓ نے قرآنِ مجید کی وہ آیت پڑھی جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے درمیان صلح کی کوشش کا حکم دیا ہے، بالآخر حضرت عائشہؓ ان کی رائے سے متفق ہوگئیں اور مشورہ طے پایا کہ جب تک بلوائیوں کا زور کم نہ ہو مدینہ نہ جانا چاہیے؛ بلکہ عرب سے باہر کوئی عافیت کی جگہ تجویز کرنا چاہیے اور کسی تدبیر سے حضرت علیؓ کو ان فسادیوں کے گروہ سے نکال کر اپنے ساتھ لے لینا چاہیے جس سے تمام کام بہ آسانی ہوجائیں گے، حضرت عثمانؓ کا قصاص بھی لے لیا جائے گا اور بلوائیوں کو سزا بھی دے دی جائے گی، چناں چہ اس مشورے کے مطابق یہ حضرات بصرہ کی طرف روانہ ہوئے، ادھر بلوائیوں کو اس کا پتہ چلا تو حضرت علیؓ کے سامنے اصل بات چھپا کر دوسری باتیں مرچ مسالے کے ساتھ ملا کر

بیان کی اور یہ بتایا کہ وہ لوگ آپ کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے ہیں، حالاں کہ اُن حضرات کی نیت یہ نہ تھی؛ لیکن فسادیوں نے حضرت علیؓ کو اصل حقیقت کی ہوا تک لگنے نہ دی، حضرت علیؓ یہ سن کر بصرہ کی جانب روانہ ہوئے، حضراتِ حسنین، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اِس کے مخالف تھے؛ لیکن فسادیوں کی رنگ آمیزی کی بنا پر ان حضرات کی ایک نہ چلی۔

مصالحت کی کوششیں اور فسادیوں کی سازش

جب حضرت علیؓ کی فوج بصرہ پہنچ گئی تو آپؓ نے حضرت قعقاعؓ کو قاصد بنا کر حضرت طلحہؓ وزبیرؓ کے پاس بھیجا، حضرت قعقاعؓ اولاً حضرت عائشہؓ سے ملے اور صاف صاف فرما دیا کہ میرا مقصود صرف اصلاح ہے کہ کسی طرح یہ فتنہ وفساد ختم ہوکر امن قائم ہوجائے، اس کے بعد حضرت قعقاعؓ نے حضرت طلحہؓ وزبیرؓ سے ملاقات کی اور پوچھا کہ آپ لوگوں نے اصلاح کی کیا صورت سوچی ہے، ان دونوں نے کہا کہ قاتلانِ عثمان سے قصاص لیے بغیر امن نہیں ہوسکتا، حضرت قعقاعؓ نے کہا یہ تو اسی وقت ممکن ہوگا جب کہ تمام مسلمان متفق ہوجائیں؛ لہٰذا آپ حضرات کو چاہیے کہ حضرت علیؓ سے مل جائیں، پھر تمام لوگ آپس میں مل کر مشورے سے اس کی تدبیر کیجیے کہ امن وامان کس طرح قائم ہوگا! یہ رائے ان دونوں حضرات کو بھی پسند آئی اور حضرت قعقاعؓ صبح حضرت علیؓ کے پاس خوشخبری لے کر گئے، حضرت علیؓ بھی بہت خوش ہوئے، تین دن لگاتار خط وکتابت اور پیام

کا سلسلہ چلتا رہا، تیسرے دن شام کو یہ بات طے پائی کہ علی الصباح حضرت علیؓ کی ملاقات حضرت طلحہ وزبیرؓ کے ساتھ اس طرح ہو کہ ان بلوائیوں میں سے کوئی بھی اس مجلس میں شریک نہ ہونے پائے، بلوائیوں کو اس بات کا علم ہوا تو سخت پریشان ہوئے؛ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اس تنہائی کی ملاقات کے بعد حضرت علیؓ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے اور ہماری شامت آجائے گی، ان لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ کوئی ایسی تدبیر نکالی جائے کہ ملاقات ہی نہ ہونے پائے۔

مشہور منافق عبداللہ بن سبا بھی ان فسادیوں میں صرف شامل ہی نہ تھا: بلکہ سب کا سردار بنا بیٹھا تھا، اس نے یہ رائے دی کہ آج ہی رات لڑائی شروع کردو اور حضرت علیؓ کو یہ اطلاع دو کہ اس فریق نے بدعہدی کرکے جنگ شروع کردی ہے، چناں چہ ایسا ہی ہوا اور ان مفسدوں نے خود ہی رات کے آخری حصہ میں حملہ شروع کردیا جس کا دوسری طرف سے بھی جواب دیا گیا۔

حضرت علیؓ کے لشکر میں یہ شہرت تھی کہ حضرت طلحہؓ وزبیرؓ نے بدعہدی کی ہے اور اس طرف یہ مشہور تھا کہ حضرت علیؓ کی طرف سے بدعہدی ہوئی ہے، غرض یہ کہ بڑی سخت لڑائی ہوئی دونوں طرف سے تقریباً تیرہ ہزار مسلمان شہید ہوئے، حضرت طلحہ وزبیر بھی اسی موقع سے شہید ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت طلحہؓ وحضرت زبیرؓ کی شہادت

حضرت طلحہؓ تو میدانِ جنگ میں ہی شہید ہوگئے۔ لڑائی کے وقت حضرت

علی رضی اللہ عنہ گھوڑا بڑھا کر میدان میں آئے اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے کہا: ابو عبد اللہ تمہیں وہ دن یاد ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم سے پوچھا تھا کہ: کیا تم علی کو دوست رکھتے ہو؟ تو تم نے عرض کیا تھا کہ ہاں یا رسول اللہ! لہٰذا تم یاد کرو اس وقت کو جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم سے فرمایا تھا کہ ایک دن تم اس سے ناحق لڑو گے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ہاں! اب مجھے یاد آ گیا، یہ پیشین گوئی یاد کر کے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ لڑائی سے منہ موڑ کر الگ چلے گئے؛ لیکن راستے میں بدبخت ابن جرموز نے آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ یہ کمبخت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے انعام کی امید لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ: امیر المؤمنین! مبارک ہو! میں نے آپ کے دشمن کو قتل کر دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا، کس کو؟ اس نے کہا: زبیر رضی اللہ عنہ کو، آپ نے تعجب وافسوس سے ملے جلے لہجہ میں تصدیق کے لیے دوبارہ دریافت کیا: زبیر کو؟ اس نے کہا: ہاں! زبیر کو، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میں تجھ کو خوشخبری سناتا ہوں کہ تو دوزخ میں جائے گا۔ اُس نے کہا واہ! آپ رضی اللہ عنہ نے خوب انعام دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھ سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: يا علي بشر قاتل ابن صفية بالنار، یعنی اے علی! میری پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے کو جو قتل کرے اس کو تم دوزخ کی خوشخبری سنا دینا، یہ سن کر ابن جرموز نے خودکشی کر لی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ منظر دیکھا اور بلند آواز سے تکبیر پڑھ کر فرمایا کہ دیکھو ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو فرمایا تھا، کیسا سچ نکلا!!!۔

(سیرت خلفائے راشدین، مؤلفہ: حضرت مولانا عبد الشکور فاروقی نور اللہ مرقدہ، ص: ۱۷۲ تا ۱۷۶)

تلواریں ہاتھ میں تھیں اور دل صاف تھے

لڑائی ختم ہونے کے بعد حضرت علی، حضرت حسن، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم میدانِ جنگ میں مقتولین کی لاشیں دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے، ایک جگہ پہنچ کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے آواز دی کہ اے والد محترم! بخدا قریش کا ایک نوجوان بچہ یہاں پڑا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: کون ہے؟ جواب دیا کہ محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''واللہ کان شابا صالحا''، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گذر حضرت طلحہ کی نعش مبارک پر ہوا، تو آپ رضی اللہ عنہ ان کو دیکھ کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے کہ ابو محمد یہاں اس حالت میں پڑے ہیں!!! کاش! میں آج سے بیس برس پہلے مر گیا ہوتا، اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ بار بار چومتے رہے، ساتھ ہی یہ بھی فرماتے رہے کہ یہ وہ ہاتھ ہے جس نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تکلیفوں کو دور کیا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اہلِ جمل کے متعلق پوچھا گیا کہ کیا وہ مشرک تھے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: نہیں وہ شرک سے دور بھاگتے تھے، کہا کہ: پھر وہ منافق تھے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، منافق تو اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں، پھر پوچھا گیا کہ: جب بات یہ ہے کہ تو اب ان کو اور کیا سمجھے، تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''إخواننا بغوا علینا'' وہ ہمارے بھائی ہیں، ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

(تطہیر الجنان بحوالۂ سیرت خلفائے راشدین، مؤلفہ: مولانا عبد الشکور فاروقی)

اس لڑائی میں قدم قدم پر ایسے واقعات پیش آئے جو حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

کی صفائی قلب پر دلالت کرتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب حملہ کی اطلاع پہنچی تو آپ رضی اللہ عنہا اونٹ پر سوار ہو کر آئیں؛ تا کہ اپنے جاں نثاروں کو سمجھا کر روک سکیں؛ لیکن آپ کی فوج نے جب ام المؤمنین کو خود تشریف لاتے دیکھا تو اور زور سے حملہ کرنے لگے؛ تا کہ اپنی بہادری و دلیری دکھا کر قرب و نزدیکی حاصل کر سکیں، اور اُدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بہادروں نے ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کو دیکھا تو اسی طرف بڑھے؛ تا کہ آپ کو بچا کر جلد از جلد لڑائی ختم کر لیں، اسی میں دونوں طرف سے کئی ہزار جنگجو مارے گئے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لانے ہی کی وجہ سے اس لڑائی کو ''جنگِ جمل'' کہا جاتا ہے۔

اسی طرح اختتامِ لڑائی پر لوگوں نے مالِ غنیمت اور قیدیوں کے متعلق دریافت کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: مالِ غنیمت جمع نہ کیا جائے، اس لیے کہ یہ لوگ ہمارے ہی بھائی ہیں۔ (مستدرک حاکم بحوالہ سیر الصحابہ، ۱/ ۲۷۵)

غرض لڑائی سے فارغ ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ، امّ المؤمنین رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور خیریت دریافت کی، ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے بھی احوال معلوم کیے، اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو عزت و احترام سے مدینہ کی جانب روانہ کیا اور دور تک پیادہ پا رخصت کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔

دار الخلافہ حجاز مقدس سے نکل کر عراق منتقل ہو گیا

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ ہی میں تھے جہاں بیعتِ

خلافت ہوئی، جس کے بعد حضرت علیؓ کو خلیفہ مان لیا گیا اور حضرت عائشہؓ حج کرنے کے لیے مکہ گئی ہوئی تھیں، حضرت طلحہؓ وزبیرؓ نے مکہ پہنچ کر دارالخلافہ مدینۂ منورہ کی حالت بیان کی، ان تمام باتوں کو سن کر باہم مشورہ سے یہ تمام حضرات حجاز چھوڑ کر عراق میں بصرہ کی جانب نکل گئے اور ان کے ساتھ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت بھی چل پڑی، مدینۂ منورہ میں حضرت علیؓ کو معلوم ہوا تو اِن حضرات کو سمجھانے کے لیے دارالخلافہ مدینۂ منورہ سے نکل کر بصرہ کی طرف کوچ کیا، اور یہیں پر ''معرکۂ جمل'' پیش آیا، اس کے بعد حضرت علیؓ کوفہ چلے گئے اور پھر لاکھ چاہنے کے باوجود مدینۂ منورہ واپسی نہ ہوسکی اور مع لشکر کے کوفہ ہی میں مقیم ہوگئے، اس طرح دارالخلافہ حجاز سے عراق منتقل ہوگیا، لہٰذا آپؓ بصرہ میں چند دن قیام کے بعد کوفہ روانہ ہوئے، اہلِ کوفہ نے قصرِ امارت میں شاہانہ انتظام کیا؛ لیکن زہد وقناعت کے شہنشاہ نے اس میں رہنے سے انکار فرمادیا اور کہا کہ: عمر بن خطابؓ نے ہمیشہ ان عالی شان محلات کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہے، مجھے بھی اس کی ضرورت نہیں، میرے لیے میدان ہی بہتر ہے۔ (سیر الصحابہ ۱/۲۷۱)

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان گفتگو اور جنگ صفین

کوفہ پہنچ کر آپؓ نے ملک کا نظم ونسق درست کیا اور حضرت معاویہ کو خط لکھا کہ: ''تم اور تمہارے ماتحت جس قدر مسلمان ہیں، سب پر میری بیعت لازم ہے، کیوں کہ مہاجرین وانصار نے عمومی اتفاق سے مجھے منصبِ خلافت کے لیے

منتخب کیا ہے، حضرات ثلاثہ: ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو بھی ان ہی لوگوں نے منتخب کیا تھا، پس تم بھی مہاجرین وانصار کی اتباع کرو، یہی سب سے بہتر طریقہ ہے، رہا قاتلانِ عثمان سے قصاص کا معاملہ تو بیعت کے بعد ہم آپس میں بیٹھ کر کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مطابق اس کا فیصلہ کریں گے''۔ (سیر الصحابہ ۱/ ۲۷۷)

جب حضرت معاویہؓ کو خط پہنچا تو انہوں نے حضرت ابومسلم خولانی کے ہاتھوں جواب لکھ کر روانہ کیا جس میں انہوں نے قاتلینِ عثمان کو حوالے کر دینے پر اصرار کیا تھا، ابومسلم نے خط کا جواب لے کر دربارِ خلافت میں پیش کرنے کے بعد بڑے رنج وغم سے عرض کیا کہ: میری گزارش ہے کہ اگر حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دو تو تمام اہلِ شام خوشی سے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے، یا تو ہمارے حوالے کر دو یا بیچ میں سے ہٹ جاؤ، ہم خود ان سے قصاص لے لیں گے، ابومسلم خولانی جب پیغام پہنچا کر باہر نکلے تو تمام لشکریوں نے بلند آواز سے چلا کر کہا کہ: ''ہم سب عثمانؓ کے قاتل ہیں''، اس وقت تقریباً دس ہزار کا مجمع تھا۔ ابومسلم نے تعجب سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے سب نے آپس میں سازش کر رکھی ہے، حضرت علیؓ کی طرف سے جواب دیا گیا کہ تم اس سے سمجھ سکتے ہو کہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں پر میرا کہاں تک اختیار ہے، گویا حالت یہ ہے کہ نہ ان کو چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ بہ آسانی حوالے کیا جا سکتا ہے۔ (سیر الصحابہ ۱/ ۲۷۸، ۲۷۹)

غرض صلح واتفاق کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں، اور پھر وہی ہوا جو نہیں ہونا

چاہیے تھا، یعنی صفین کے مقام پر دونوں اسلامی لشکر ٹکرائے۔ اس لڑائی کے بارے میں امامِ اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور فاروقیؒ رقم طراز ہیں کہ: اس لڑائی کی بنیاد یہ تھی کہ حضرت معاویہؓ حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ چاہتے تھے، اور حضرت علیؓ فرماتے تھے کہ بلوائیوں کی قوت زیادہ ہے، لہٰذا ابھی ان سے قصاص نہیں لیا جاسکتا، حضرت معاویہؓ یہ کہتے تھے کہ آپ ان کے درمیان سے ہٹ جائیں تو میں ابھی ان سے قصاص لے لوں، درمیان میں صلح کی کوششیں برابر جاری رہیں؛ لیکن بے سود، اسی بات میں کسی قدر طول ہوا جس کا بھر پور فائدہ بلوائیوں نے اٹھایا اور جنگِ جمل کی طرح یہاں بھی اپنی فطری عیاری ومکاری کا جال بچھایا، حتی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ کو فوج کشی کرنی پڑی۔ چناں چہ صفین کے مقام پر بڑا سخت مقابلہ ہوا، لڑائی اپنے اختتام کو پہنچنا چاہتی تھی کہ اہلِ شام کی طرف سے قرآنِ کریم کے نسخے نیزوں پر باندھ کر بلند کیے گئے، گویا زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ ہمارے درمیان قرآن فیصل ہوگا، اور اس کے لیے دو شخص مقرر کیے جائیں گے، ایک حضرت علیؓ کی طرف سے اور ایک حضرت معاویہؓ کی طرف سے، دونوں مل کر جو فیصلہ کریں گے فریقین اس پر عمل کریں گے، حضرت علیؓ نے اپنی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو اور حضرت معاویہؓ نے عمرو بن عاصؓ کو حَکَم مقرر کیا، اور دونوں کو میدانِ جنگ سے دور دومۃ الجندل میں بھیج دیا گیا، چند مہینوں کے بعد فیصلہ حضرت علیؓ کے خلاف کیا گیا، جس کو سن کر